خطبات متعلق کارنامۂ حسینی و مجاہدۂ کربلا

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

واقعۂ کربلا سے درس اخلاق

(گنگا پرشاد میموریل ہال امین آباد، لکھنؤ کی ایک تقریر)

اخلاق کی دنیا بہت وسیع ہے یہاں تک کہ بڑی ضخیم کتابیں فن اخلاق پر تصنیف ہو چکی ہیں وہ صدیوں سے مستقل علم بنا ہوا ہے۔

بظاہر ایسا بھی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اخلاق کے معیار یکساں نہیں۔ بعض ملکوں اور قوموں میں جو باتیں محاسن اخلاق میں سمجھی جاتی ہیں وہیں دوسری جگہوں یا دوسری قوموں میں بری خیال کی جاتی ہیں۔ ایک وقت میں جو چیز خوش اخلاقی میں داخل ہوتی ہے دوسرے وقت میں بد اخلاقی قرار پاجاتی ہے۔ اس طرح اخلاق کے حدود کی پوری تعین دشوار محسوس ہونے لگتی ہے۔

لیکن غور کرنے پر سمجھ میں آتا ہے کہ خوش اخلاقی اور بد اخلاقی کے حدود میں جو کچھ اختلاف یا ابہام نظر آتا ہے وہ جزئیات کے اعتبار سے ہے مگر وہ کلی معیار جس کے تحت میں آنے سے کوئی شے خوش اخلاقی یا بد اخلاقی بن سکتی ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ وہ مفہوم بھی دونوں قسم کے اخلاق کا عدل اور ظلم ہے۔ جو شے عدل کے تحت میں داخل ہو وہ سب کے نزدیک مستحسن ہوگی اور جو ظلم کے تحت میں ہو وہ سب کے نزدیک مذموم۔ یہ اور بات ہے کہ کسی شے کے بارے میں اس امر میں اختلاف ہوجائے کہ وہ ان میں کس عنوان کے تحت داخل ہے۔

عدالت کا جامع اور وسیع مفہوم کیا ہے؟ حقوق وحدود کی حفاظت اور ظلم کیا ہے؟ حقوق وحدود کے خطوط سے تجاوز۔ قرآن مجید نے بھی ظلم کا معیار یہی بتایا ہے: وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ "جو قدرت کی مقرر کردہ حدوں سے قدم آگے بڑھاتے ہیں وہ ظالم ہیں۔"

اختلاف صحیح حدود کی تعیین اور جائز حقوق کی تشخیص میں ہوتا ہے مگر حق کو ماننے کے بعد ہر شخص اس سے تجاوز کرنے والے کو ظالم اور اس ظالم کو قابل مذمت وملامت سمجھے گا۔ اختلاف اس میں ہوگا کہ یہ ظلم ہے یا نہیں لیکن ظلم ہر ایک کے نزدیک برا ہوگا۔ چاہے وہ کسی بھی قوم یا ملک کا پرورش یافتہ اور باشندہ ہو۔ یہ اصول اخلاق ہیں۔ انہی کے حکم میں ہیں امانت اور خیانت، سچائی اور دروغ گوئی وغیرہ۔

یقین کیا جاسکتا ہے کہ جو جھوٹا ہے وہ بھی سچ کو اچھا سمجھتا ہے ورنہ سچا بننے کی کوشش نہ کرے اور اگر سچا ہے نہیں تو جھوٹا ہی کیوں قرار پائے۔ جھوٹ کی عمارت خود قائم ہے سچائی کی قدر ومنزلت کے احساس پر۔ اسی طرح کوئی بڑے سے بڑا بد دیانت ہو اسے "بے ایمان" کہئے تو وہ برا مانے گا اور اسے دشنام سمجھے گا۔ ظالم کو اگر ظالم کہئے تو وہ خوش نہ ہوگا اور خائن کو خائن کہئے تو وہ ہرگز بالیدہ نہ ہوگا۔

یہ دلیل ہے اس کی کہ ان اصول اخلاق کا احساس عقل عمومی اور فطرت بشری میں متفقہ حیثیت سے مضمر ہے۔ ہر شخص ان اچھے اخلاق کو پسند اور برے اخلاق کو ناپسند کرتا ہے۔ چاہے وہ خود ان برائیوں میں مبتلا ہو۔

اس کی ایک آسان پہچان یہ ہے کہ یہ شخص خود جب کبھی کسی کی مذمت کرتا ہے تو دیکھئے وہ اس کے بارے میں کیا کیا کہتا ہے؟ یقیناً وہ اس کی برائیوں میں یہی کچھ کہے گا کہ مکار ہے، دغاباز ہے، جعل ساز ہے، جھوٹا ہے، ظالم ہے، بے ایمان ہے وغیرہ وغیرہ۔ بس اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب باتیں اس کے نزدیک بھی برائی میں داخل ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ خود عملاً ان سے متصف ہے۔ اسی طرح جب وہ کسی کی تعریف کرنا چاہے تو دیکھئے کیا کہتا ہے؟ سوا اس کے کچھ نہیں کہ وہ بڑا ایماندار ہے، بڑا سچا ہے، بڑا ہمدرد ہے، بڑا منصف ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس سے ثابت ہے کہ مدح اور مذمت کے اقدار سب کے نزدیک بلا اختلاف معین ومقرر ہیں اور یہ وہ محامد اخلاق ہیں جن کا شعور فطرت انسانی میں مضمر ہے۔

كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى فِطْرَةِ الْإِسْلَامِ۔ ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر برائیوں کی طرف کیونکر جاتا ہے؟ خارجی محرّکات سے جن کا جامع عنوان ہے طمع اور خوف طمع کی ایک منزل ہے صرف وقتی حظ نفس، اس کے آگے مال ودولت، جاہ وثروت یا شہرت اور کبھی صرف ہم رنگ جماعت ہونے کی لذت۔

مال ودولت میں بھی انسانوں کی قیمت مختلف ہے۔ کوئی چند پیسوں میں راہ حق سے ہٹنے کے لئے تیار ہوجاتا ہے۔ کسی کے لئے چند روپیوں کی ضرورت ہوتی اور کسی کا نرخ سیکڑوں یا ہزاروں تک پہنچتا ہے۔ اس کی وجہ سے انسان کے سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ دس ہزار کی رشوت کسی کے سامنے پیش کی گئی۔ اس نے منھ پھیر لیا۔ آپ نے کہا بڑا دیانتدار ہے مگر آپ کو اس کے دل کی حالت کیا معلوم۔ شاید وہ اس قیمت کو اپنے لئے کم سمجھ کر روگردان ہوا ہو۔ اگر اس رقم کو دونا کردیا جاتا تو وہ معاملہ کے لئے تیار ہوجاتا۔ اسی لئے سچائی کے سب سے بڑے علم بردار حضرت محمد مصطفیٰؐ کے سامنے جب ان کی حق پرستی کے مقابلہ میں قیمتیں پیش کی گئیں کہ جس عرب خاندان میں کہئے آپ کی شادی کردی جائے۔ جتنا مال ودولت کہئے حاضر کردیا جائے، فرمایئے تو ہم آپ کو اپنا بادشاہ تسلیم کرلیں تو اگرچہ ان لوگوں نے اپنے پیمانۂ نظر کے مطابق بڑی سے بڑی چیزیں پیش کی تھیں مگر آپ نے جواب میں صرف انکار پر اکتفا نہیں فرمائی کیونکہ اس میں اس تصور کی گنجائش تھی کہ اگر اس سے بڑھ کر کوئی چیز لائی جائے تو شاید نفس بک جائے بلکہ آپ نے جواب میں اپنی طرف سے ایک ایسا پیمانہ پیش کردیا جو حدود وامکان سے خارج ہے یعنی یہ کہ اگر میرے ایک ہاتھ پر چاند رکھ دو اور دوسرے ہاتھ پر سورج تو بھی اس پیام حق کی تبلیغ نہ چھوڑوں گا۔ اس کے بعد کوئی منزل نہیں رہ جاتی اس تصور کی کہ کوئی شئے ایسی ہوسکتی ہے جو کہ انھیں جادۂ حقیقت سے متزلزل بنا سکے۔

دوسری چیز ہوتی ہے خوف اس میں بھی منزلیں مختلف ہوتی ہیں کوئی ذرا سے مالی نقصان کو نہیں برداشت کرسکتا، کوئی مالی نقصان کی پرواہ نہیں کرتا مگر جان کی نوبت آجائے تو خائف ہوتا ہے۔ کوئی آبروریزی سے ڈر کر متاثر ہوتا ہے اور ان تمام خطرات سے تحفظ کبھی عقلی وشرعی معیار پر مستحسن بھی ہوتا ہے۔ یہ اس وقت جب کہ مقصد ان سے زیادہ اہم نہ ہو۔ پھر بعض لوگ تو ایسے ہوتے ہیں جنھیں صرف خطرات موہوم

لب کشائی سے مانع ہوتے ہیں اور بعض ایسے جو خطروں کے یقینی ہوجانے کے بعد سپر انداختہ ہوتے ہیں۔

جب یہ معلوم ہوگیا کہ اخلاق حسنہ کی تحریک کم از کم ان کی تائید فطرت میں داخل ہے لیکن یہ خارجی محرکات یعنی طمع اور خوف وہ ہیں جو اس راستے سے ہٹاتے ہیں اور افراد انسانی کو عملاً بداخلاقی کی طرف لے جاتے ہیں تو اب اصلی مدرس اخلاق وہ نہیں ہے جو دنیا کے سامنے بس ان سبقوں کو دہرائے کہ حق پر قائم رہنا اچھی چیز ہے۔ عدل وانصاف اچھی چیز ہے۔ امانت و دیانت اچھی چیز ہے۔ یہ درس اپنی جگہ ہے بالکل درست مگر وہ اس لئے زیادہ وزنی نہیں کہ ان باتوں کو اچھا تو خود ہر انسان کا ضمیر سمجھتا ہے مگر وہ سمجھنا کس کام کا جس کے مطابق عمل نہ ہوسکے اور عمل نہیں ہوتا فطرت پر دباؤ ڈالنے والے انہی رجحانات یعنی طمع اور خوف سے۔ پھر اصل درس اخلاق کہاں ملے گا اور حقیقی مدرسۂ اخلاق کسے سمجھنا صحیح ہے۔ اسی مرکز کو جہاں ان رجحانات کو شکست دے کر عملاً دکھا دیا گیا ہو اور نمونہ پیش ہوا ہو کہ کس طرح ایک مرد خدا کو دنیا کی کوئی طمع اور کسی قسم کا خوف وخطر راہ حق سے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ جس نے عملی طور پر یہ مثال پیش کردی ہو وہی سب سے بڑا معلم اخلاق ہے۔ اس کی بارگاہ سے ہمیں یہ درس ملے گا کہ کس طرح ہم اچھائی اور سچائی کے راستے پر قائم رہیں اور بڑی سے بڑی طاقت ہم کو اس سے ہٹا نہ سکے۔

ہمارا عالم کیا ہے؟ ذرا اپنے نفسیات کا جائزہ لیجئے۔ صرف ایک عدد آدمی۔ جی ہاں فقط ایک وہ بڑا آدمی ہے ہم سے کسی بات کو کہتا ہے جسے ہم سمجھتے ہیں کہ غلط ہے مگر چونکہ وہ بڑا آدمی ہے اس لئے ہمیں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ اس سے انکار کردیں۔

الیکشن میں کیا ہوتا ہے؟ طے کئے ہوئے ہوتے ہیں کہ اب فلاں کو ووٹ نہ دیں گے مگر الیکشن سے پہلے ایک بڑی ہستی غریب خانہ پر آگئی۔ حالانکہ اس کے پہلے یہ ہستی وہ تھی کہ راستے میں ملتی اور یہ غریب جھک کر سلام کرتا تو وہ منھ پھرا لیتے یا گوشۂ ابرو سے جواب سلام دیتے مگر آج ووٹ لینا ہے تو وہ خود غریب خانہ پر تشریف لائے ہیں۔ بس جناب! اب تو منھ سے نہیں نکل سکتا کہ جی میں تو دوسرے شخص کو بہتر سمجھتا ہوں اب سوا اقرار کے انکار ممکن ہی نہیں اور نتیجہ میں کیا ممکن کہ سوا اس شخص کے کسی دوسرے کو ووٹ مل جائے۔ اگر کسی نے پوچھ لیا کہ ارے، یہ کیا تم ان کی بہت برائیاں کرتے تھے۔ اب ووٹ انہی کو دے رہے ہو، کہا کیا بتاؤں، فلاں صاحب غریب خانہ پر خود تشریف لائے، اب مخالفت کیونکر ہوسکتی ہے؟ یہاں نہ توپ ہے، نہ بندوق۔ نہ تلوار کچھ نہیں۔ بس فقط ''بڑے آدمی'' اور ''انھوں نے یہ فرمایا'' نظام جمہوریت میں اکثریت کے آراء اکثر اسی قسم کے رجحانات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی اکثریت حقانیت کی ضمانت دار کہاں ہوسکتی ہے مگر عام طور سے اہل دنیا اسی راستے پر چلتے، اسی سیلاب میں بہتے اور اسی ہوا میں اُڑتے ہیں۔

بڑے آدمی کے خلاف چھوٹا، اکثریت کے مقابلہ میں کوئی ایک آدمی اول تو سوچتا ہی نہیں۔ عموماً ایک آدمی انہی ہزار کی آنکھوں سے دیکھنے لگتا ہے۔ اپنی آنکھ کی طاقت سے کام نہیں لیتا اور اگر سوچتا ہے یعنی دماغ کی طاقت جواب نہیں دیتی تو دل کی ہمت ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ جو کچھ سوچا ہے اور سمجھا ہے اس کے مطابق کہہ نہیں سکتا اور عمل نہیں کرسکتا۔

تمام بداخلاقیوں اور غلط کاریوں کا سرچشمہ اس قسم کے محرکات ہیں لہٰذا جس نے ان محرکات میں سے ہر چیز کو شکست دے دی ہو اس سے بڑھ کر معلم اخلاق کون ہے؟

حسینؑ اسی ہستی کے ورثہ دار تھے جس کا اعلان یہ تھا کہ اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخلَاقِ ''میں صرف اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاق فاضلہ کی تکمیل کروں''۔ اور جسے خالق نے سند یہی عطا کی تھی کہ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ''آپ عظیم اخلاق کے درجہ پر فائز ہیں''حسینؑ نے ان کی گود میں پرورش اسی دن کے لئے پائی تھی کہ یہ ان کے کام کو عملی دنیا میں انتہائی نقطہ پر پیش کر کے دکھا دیں۔ انھوں نے ثابت کر دیا کہ میرے جد بزرگوار کے اخلاقی تعلیمات کوئی خیالی حیثیت نہیں رکھتے جو علمائے اخلاق کے خوبصورت درس کی طرح کتابوں کے صفحات میں محدود رہیں بلکہ یہ عملی حیثیت رکھتے ہیں، ایسی جو کم از کم بہتر افراد کی جماعت کے اندر جیتی جاگتی شکل میں نظر آرہے ہیں۔

کسی مذہب کی تاریخ میں ڈھونڈھنے سے بیک وقت دو چار فرد یں شاید مل جائیں جو اس کے تعلیمات کا معیاری نمونہ پیش کر سکیں لیکن یہ اسلام کے مدرسۂ اخلاق کی خصوصیت تھی۔ اہلبیت رسولؐ کے زیر تربیت بیک وقت اتنی بڑی جماعت دنیا کے سامنے پیش ہو رہی تھی جس کی مثال صفحۂ کائنات پر دوسری نہیں ملتی۔

اس سے سمجھئے کہ کربلا کے واقعہ کو دنیائے انسانیت کے لئے کب تک یاد رکھنے کی ضرورت ہے؟ جب تک اس کا قائم مقام کوئی دوسرا مل نہ جائے اور یہی راز ہے اس کارنامہ کی ہمہ گیر کشش اور اس کے تذکرہ کی دائمی بقا کا۔

حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کے سامنے وہ تمام چیزیں تھیں جو کسی انسان کو راہِ حقیقت سے ہٹایا کرتی اور مکارم اخلاق کے جادہ سے منحرف بناتی ہیں۔

شخصیت کے اعتبار سے دیکھئے تو بیعت طلب کرنے والا یزید تھا جو عالم اسلامی کا شہنشاہ بنا ہوا تھا۔ کثرت اس طرف تھی اور کیسی کثرت۔ بلا مبالغہ تمام دنیائے اسلام اس کے سامنے سر جھکا چکی تھی اور سب ہی بیعت کر چکے تھے اور اگر سب بیعت نہ کر چکے ہوتے تو تاریخ ان اشخاص کے ناموں کو شمار کر کے ہمارے سامنے کیوں پیش کرتی جنھوں نے بیعت نہیں کی تھی۔ خود یزید کے باپ امیر شام معاویہ کے یہی الفاظ تاریخ میں درج ہیں جو یزید سے مخاطب ہو کر کہے تھے کہ میں نے تمام مسلمانوں کی گردنیں تیرے لئے جھکا دیں ہیں۔ صرف چار آدمیوں سے مجھے دغدغہ باقی ہے۔ یہ چار بھی کہنے کو چار تھے ورنہ امیر شام خوب جانتے تھے کہ ان میں اصل حسینؑ ہیں چنانچہ انھوں نے مدینہ میں آنے کے بعد امام حسینؑ کو دیکھ کر یہی کہا تھا کہ ابھی تک چار آدمی الگ ہیں جن میں قیادت کرنے والے آپ ہیں۔

پھر اس شخصیت اور اکثریت کے مقابلہ میں امامؑ کا یہ فرمانا کہ بیعت نہیں کروں گا، اس میں خطرات کیا در پیش تھے؟ جتنے قسم کے خطرے کسی کے پیش نظر ہو سکتے ہیں وہ سب مجموعی طور پر امام کے پیش نظر تھے چنانچہ وہ خطرے تدریجی طور پر واقعیت کی شکل اختیار کرتے رہے مگر حسینؑ نے جو انکار کیا تھا وہ کب تک باقی رہا؟ اس کی حد کون بتا سکتا ہے۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ ظلم وتشدد کے امکان میں آگے بڑھنے کی گنجائش نہ رہی اور حسینؑ کا انکار اپنے محل پر برقرار رہا۔ یہاں تک کہ یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ کسی رسول، کسی نبی، کسی مصلح، کسی داعی حق کے بارے میں ہم معین کر کے یہ بتا سکتے ہیں کہ اس نے کیا قربانی پیش کی مگر امام حسینؑ کے بارے میں تو یہ ڈھونڈھنا ہے کہ کون چیز قربان نہیں کی اور ڈھونڈھنے پر اس تلاش میں کامیابی ناممکن معلوم ہوتی ہے۔

دشمن اسلحہ بڑھاتا رہا۔ دباؤ زیادہ سے زیادہ کرتا گیا مگر

وہ ذرّہ بھر بھی حسینؑ کو متاثر نہ کر سکا۔ حُر کے ساتھ والا ایک ہزار کا رسالہ ہی کیا کم تھا۔ زہیر بن قین کہہ رہے تھے کہ مولا ہمیں ان سے نپٹ لینے دیجئے ورنہ اتنی بڑی فوج آجائے گی جس کا ہم مقابلہ نہ کر سکیں گے مگر ایک ہزار اور ایک لاکھ میں فرق تو وہ دیکھے جو کسی نقطہ پر بھی کثرت تعداد سے مرعوب ہوسکتا ہو۔ امامؑ کو تو اصول پیش نظر تھا۔ اخلاقی اصول کہ ہم جنگ میں ابتدا نہیں کرنا چاہتے۔ اس کے نتیجہ میں چاہے ایک ہزار کا لشکر بڑھ کر تیس ہزار تک پہنچے اور چاہے ایک لاکھ تک۔

۶ رمحرم تک زمین کربلا کثرت لشکر سے چھلکنے لگی۔ ساتویں سے پانی بند کر دیا گیا۔ حسینؑ اکیلے نہیں تھے۔ ان کے ساتھ عورتیں اور چھوٹے چھوٹے بچے موجود تھے۔ ایک دو وقت نہیں تین دن گذر گئے۔ بچے العطش العطش کہہ رہے تھے۔ خود امام کی پیاس سے یہ حالت تھی کہ معلوم ہوتا تھا آنکھوں کے سامنے دھواں چھایا ہوا ہے مگر اس پر بھی انکار بیعت کے عزم میں کچھ بھی ضعف نہ تھا۔ امام کا کیا ذکر کوئی بچہ تک یہ نہیں کہہ رہا تھا کہ اب تو سختیاں نہیں اُٹھ سکتیں۔ اب یزید کی بیعت ہی کر لی جائے۔

اس کے بعد عاشور کے دن جو کچھ ہوا کسے معلوم نہیں، دشمن کے پاس کوئی حربہ باقی نہیں رہا۔ سب حربے ختم ہو گئے مگر حسینؑ پر اثر نہ ڈال سکے۔ آخر میں ظالم بے بس ثابت ہوا اور صبر کا اقتدار اپنی جگہ قائم رہا۔

آخر میں نیزوں پر سر تھے اور لٹا ہوا اسیروں کا قافلہ تھا۔ اسے ظالم اپنی فتح کا اعلان سمجھ رہا تھا مگر وہ تو درحقیقت حسینؑ کی فتح کا اعلان تھا۔ نیزوں پر وہ سر نہ تھے۔ انکار بیعت پر قیام کے علم تھے جو دشمنوں کے ہاتھوں ہی سے بلند تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ تماشا دیکھنے والوں چاہے تم تماشا ہی دیکھتے رہے مگر تم گواہ رہنا کہ کہ ہم نے بیعت نہیں کی اور پیغمبر اسلام کے وارث اور ان کے پورے خاندان نے یزید کو جائز خلیفہ نہیں مانا۔

حسینؑ اور ان کا کارنامہ جس کے پیش نظر رہے وہ ممکن نہیں کہ سچائی اور اچھائی کی راہ کو کسی بھی ناجائز دباؤ سے چھوڑ دے۔ انسان اگر حق سے ہٹے گا تو حسینؑ کو بھول کر ہی ہٹے گا اور یہی مکارم اخلاق کے بقا و قیام کا سنگ بنیاد ہے۔

اس کے علاوہ جزئی طور پر بھی امام حسینؑ نے کربلا میں جن مکارم اخلاق کے ہر شعبہ پر عمل کر کے ہر ایک کے لئے ایک مثال قائم کر دی، حقوق اللہ اور حقوق الناس کسی شعبہ کو تشنۂ عمل نہیں چھوڑا۔ حالانکہ یہ سب وہ چیزیں ہیں جن کی پابندی کا عموماً سکون واطمینان کے اوقات میں موقع سمجھا جاتا ہے۔ مصیبت واضطراب کے ہنگام تو مستثنیات میں داخل ہوتے ہیں اور اس وقت اگر اخلاقیات میں سے کسی اصول کی پابندی نہ بھی کی جائے تو اسے فروگزاشت نہیں سمجھا جاتا جیسے ایک شخص انتہائی پابند شرع، نماز فریضہ کو اول وقت بجالانے کا پابند ہے مگر مصیبت، خوف و دہشت یا کسی بھی اضطراب کے موقع پر نماز دیر سے پڑھتا ہے اور بلا کسی شرم وندامت کے کہتا ہے کہ آج اتنا پریشان تھا کہ نماز بھی اول وقت نہ پڑھی اور عقلاء بھی اس کو ذرہ برابر موردالزام نہیں سمجھتے۔

ایک نہایت با اخلاق شخص ہمیشہ خود سے سلام کرنے کا عادی اور کسی پریشانی کے ہنگام میں دوسرا اسلام کرتا ہے، وہ جلد اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور قابل معافی سمجھا جاتا ہے۔

اب کربلا سے بڑھ کے تصور کیجئے کہ کیا کوئی ہنگام مصیبت و دہشت واضطراب ہوسکتا ہے؟ اور اس کے باوجود امام کا نماز کے متعلق اہتمام دیکھئے۔ اعزاء کے ساتھ سلوک میں حفظ مراتب کا خیال دیکھئے اور ہر ایک کے ساتھ حسن

سلوک دیکھئے۔

ان مواقع پر اخلاق کو برت کر حسینؑ نے دماغِ انسانی میں ان اخلاق کے جذب ہوجانے کی وہ صلاحیت پیدا کردی ہے جس کا محو ہونا غیر ممکن ہے۔

انتہا یہ ہے کہ اس وقت جب آپ رخصت آخر کے لئے درخیمہ پر تشریف لائے ہیں اس وقت کے عالم کا خیال کیجئے۔ انصار رخصت ہوچکے ہیں، اعزاء داغ مفارقت دے چکے ہیں، بھائی کے مارے جانے سے کمر ٹوٹ چکی ہے، جوان بیٹے کو دم توڑتے آنکھوں سے دیکھا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ابھی شیر خوار بچہ کی قبر بنا کر اٹھے ہیں۔ اب خود سفر آخرت کے لئے جارہے ہیں ایسے عالم میں اخلاق کا خیال ہے۔

حالانکہ خیام حسینؑ میں سب حسینؑ سے ہر حیثیت سے چھوٹے ہی ہیں مگر امام درخیمہ پر آکر سلام کرتے ہیں اور نام بنام کسی طبقہ کو نظر انداز نہیں کرتے یہاں تک کہ گھر کی کنیز فضہ تک کو یاد فرماتے ہیں۔ کیا یہ عام انسانی طاقت فہم سے بالا نمونہ نہیں ہے؟

اور ملاحظہ کیجئے۔ میدان جہاد سے جس نے آواز دی حسینؑ وقت آخر اس کے سرہانے پہنچے۔ اس میں امام پر تعب ومشقت کتنا بڑھ گیا۔ خیمہ گاہ سے مقتل کا فاصلہ اور اس تمازت آفتاب اور تین دن کی پیاس میں اتنی دفعہ جانا اور اتنی دفعہ آنا مگر کیا ممکن تھا کہ حضرت امام حسینؑ اپنے اس دستور میں کوئی فرق آنے دیتے۔

بلکہ جس میں احساس کمتری کا اندیشہ تھا اس کے لئے خصوصیت بڑھادی۔ جون غلام ابوذر کے سرہانے فقط گئے ہی نہیں بلکہ اس کے رخسارہ پر رخسارہ رکھا اور بارگاہ الٰہی میں اس کے لئے دعائیں فرمائیں۔

یقینا یہ وہ اخلاقی اصول کی انجام دہی تھی جو ان حالات میں حسینؑ کے سوا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔

عراق کے راستے میں امام حسینؑ نے دشمنوں کی فوج کو پانی پلایا تھا۔ یہی اخلاق کا عمل کیا کم تھا مگر اس سے بڑی معراج اخلاق اس میں نظر آتی ہے کہ کربلا میں جب انہی دشمنوں نے پانی بند کردیا اور چھوٹے بچے تک پیاس کی شدت سے بیتاب تھے اور پانی کے لئے تڑپ رہے تھے تو امام نے ہر طرح پانی مانگا مگر کبھی اپنا وہ سلوک یاد نہیں دلایا کہ میں نے پانی پلایا تھا۔ اس لئے کہ احسان کرکے اسے یاد دلانا بلند ظرفی کا مقتضا نہیں ہے۔

ایسے ہی کتنے درس اخلاق ہیں جو کارنامۂ حسینی کے تفصیلات میں مضمر ہیں جن کی یاد قائم رکھنا اور ان پر عمل پیرا ہونا انسان کو حقیقی انسانیت سے روشناس بنانے کا ضامن ہے۔

''جنھیں یہ احساس ہے کہ ہمارا مالک اللہ ہے اور وہ اس پر قائم و برقرار رہتے ہیں انھیں نہ قبل وقوع واقعہ خطرہ ہوگا اور نہ بعد وقوع واقعہ افسوس ہوگا''

اب اس معیار پر واقعات کی روشنی میں دیکھئے کہ واقعہ کربلا کے پہلے خوف کسے تھا؟ حسینؑ کو یا ان کے مخالفین کو اور بعد وقوع افسوس کسے ہوا؟ حسینؑ کو یا یزید کو؟

ظاہری اسباب کی بنا پر تو سلطنت وقت کو خوف کی کوئی وجہ نہ تھی اس لئے کہ تمام عالم اسلامی بیعت کرچکا تھا۔ معدودے چند تھے جنھوں نے بیعت نہیں کی تھی۔ ان میں بھی بعض کے متعلق معلوم تھا کہ وہ کمزور دل کے اشخاص ہیں۔ مضبوط ارادے کے مالک جو تھے وہ ایک حضرت امام حسینؑ تھے۔ پھر بھی یزید مبتلائے خوف تھا۔

حضرت امام حسینؑ سے طلب بیعت خود خوف کا نتیجہ تھا وہ جانتا تھا کہ سب سہی مگر حق میری طرف نہیں۔ یہی خلش کہ

حق میری طرف نہیں محرک ہوئی کہ علم بردار حق سے بیعت لی جائے۔ یزید جانتا تھا کہ حسینؑ کو امت اسلامیہ پر حکومت کا حق ہے اور حقیقی سردار مسلمانوں کے حسینؑ ہیں یہی وجہ رقابت ہوسکتی تھی ورنہ بادشاہ کو فقیر سے، ایک صاحب تاج وتخت، مالک جاہ وحشم کو ایک زاہد گوشہ نشین سے رقابت کے معنی ہی کیا ہیں۔

پھر اگر یزید کی حکومت بنام دنیا ہوتی تو بھی یہ کد نہ ہوتی مگر وہ حکومت تو بنام دین تھی بنام جانشینی رسول تھی اور حسینؑ محافظ دین اسلام اور حقیقی جانشین رسولؐ تھے بس یہ وجہ عناد ومخالفت تھی اور یہ خوف تھا کہ نہ جانے کب دنیا اصل مرکز کی طرف کھنچ جائے۔ اس لئے حصول بیعت کی فکر تھی۔

مگر حسینؑ......وہ مطمئن تھے۔ انھیں کوئی خوف نہ تھا کیونکہ وہ اللہ کو اپنا رب سمجھتے تھے جب انھوں نے کہا کہ میں بیعت نہیں کروں گا تو چاہے دنیا نہ سمجھتی ہو مگر وہ جانتے تھے کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے۔ انھوں نے سب کچھ سمجھ کر کہا تھا کہ میں بیعت نہیں کروں گا۔ اس کے مفہوم میں یہ سب داخل تھا کہ بیعت نہیں کروں گا چاہے وطن چھوڑنا پڑے بیعت نہیں کروں گا چاہے سب انصار قتل ہوجائیں بیعت نہیں کروں گا چاہے برابر کا بھائی جوان بیٹا، بھتیجے بھانجے سب کام آجائیں۔

دنیا نے دیکھ لیا کہ حسینؑ نے اس وقت انکار کیا تھا جب تمام انصار واعزا موجود تھے اور حسینؑ اس وقت بھی انکار پر قائم رہے جب کوئی پاس نہ رہا بلکہ اس وقت بھی جب سر قلم کردیا گیا۔ یزید کا طلب بیعت تھا خوف کا نتیجہ اور امام حسینؑ کا انکار بیعت تھا بےخوفی کا نتیجہ۔

اس کے بعد یہ کہ کیا یزید اور ابن زیاد کے ذرائع خبر رسانی یہ نہ بتارہے تھے کہ امام حسینؑ کے ساتھ کتنے آدمی ہیں تو پھر ذرا غور کیجئے کہ عام نظام اسباب کے مطابق سو ڈیڑھ سو افراد کے لئے کتنی فوج درکار ہے؟ ظاہر ہے کہ زیادہ سے زیادہ پانچ سو افراد اور زیادہ لے لیجئے ایک ہزار۔ پھر کربلا میں یہ تیس ہزار فوج کیوں اکٹھا کی گئی؟ یہ صرف خوف کا اثر ہوسکتا ہے جو بے اطمینانی ضمیر کا نتیجہ ہے حقانیت کی بے پناہ طاقت سے یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ جو فوج بھیجی جائے اسی میں کے بہت سے افراد کہیں حسینؑ کی طرف نہ چلے جائیں۔ اس خطرہ کی صحت حُر کی شکل میں ظاہر ہوگئی۔

لشکر کی تعداد کا بڑھانا خود ان میں سے ہر فرد کے ضمیر پر دباؤ ڈالنا تھا۔ اب کسی ایک کا اس فوج سے الگ ہونا تیس ہزار کے قصد وآہنگ سے جنگ کرنا تھا۔ نفسیاتی طور پر ساتھیوں کی کثرت ہر فرد کے لئے بہت شدید زنجیر ہوتی ہے اس کے لئے ایسا ہی قوی ارادہ کا مالک تیار ہوسکتا تھا جو تیس ہزار کے متحدہ راستے کے خلاف اپنا جادہ بنا سکے۔

یہ تو اُدھر کے خوف کا عالم تھا اور امام کی بےخوفی دیکھئے کہ جو جماعت قلیل ساتھ تھی اُسے بھی رخصت کر رہے تھے ایک فقرہ تو امام نے ایسا کہہ دیا کہ شاید اصحاب بھی یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے ہوں گے کہ کہیں واقعی امام ہمیں رخصت کردینا ہی تو مناسب نہیں سمجھتے۔ وہ فقرہ یہ تھا کہ ''میرے عزیزوں کو بھی اپنے ساتھ لیتے جاؤ'' حالانکہ اس ارشاد میں اس کا اظہار مضمر تھا کہ یہ ساتھ چھوڑنے کی تحریک بے اعتمادی یا بیگانگی کے احساس کی بنا پر نہیں ہے اور بے اعتمادی کا تصور یوں بھی ختم فرمایا کہ آپ نے وفاداری کی سند پہلے ہی دے دی تھی کہ **انی لا اعلم اصحابا اوفی من اصحابی ولا اھل بیت ابر ولا اوصل من اھل بیتی**۔ یہ بےخوفی کا اعلان نہیں تو اور کیا ہے کہ امام اصحاب کی زندگیاں ان کو واپس کئے دیتے ہیں اور وہ انھیں امام کے قدموں پر ڈالے دیتے ہیں آپ ان سے بے

نیاز اور وہ اپنی زندگیوں سے بے نیاز۔

استقامت علی الحق کا معیاری نمونہ

(۵؍جون ۱۹۵۵ء کو سیتاپور کے حسینی ڈے میں تقریر)

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔

''وہ جن کا قول یہ ہے کہ ہمارا مالک اللہ ہے اور پھر وہ اس پر برقرار بھی رہتے ہیں نہ ان کے لئے کوئی خوف ہے اور نہ انھیں رنج ہوگا۔''

''قول یہ ہے'' اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ لفظیں زبان پر ہیں بلکہ مقولہ سے مراد ہے ان کا اصول حیات جو ان کے لوح دل پر نقش ہے۔

اکثر جگہ قول کا استعمال جو قرآن میں ہے وہ اس معنی سے ہے جیسے قُلْ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ مَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ یہ کوئی ورد نہیں ہے جس کے زبان سے دہرانے کا حکم ہو بلکہ یہ ایک حقیقی مسلم کا نصب العین ہے جسے پیش کیا جارہا ہے اسی طرح قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ اس کا بھی یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ الفاظ تمہاری زبان سے ادا ہونا چاہئیں بلکہ تمہارے پیش نظر ہمیشہ یہ رہنا چاہئے۔ تمہارا عقیدہ یہ ہونا چاہئے تمہاری زندگی سراپا اس حقیقت کا اعلان ہونا چاہئے۔

ان کا قول کیا ہے؟ یہ کہ ہمارا مالک اللہ ہے۔ اللہ وہ بلند و برتر ذات جس سے بزرگ و برتر کوئی دوسرا تصور ہونا ممکن نہیں اور وہ ذات جو نیکی ہی کو پسند کرتی ہے اور بدی سے ممانعت کرتی ہے جب یہ ذہن میں رہے گا کہ ہمارا مالک وہ ہے تو انسان سچائی اور اچھائی کے راستے سے منحرف نہ ہوگا کیونکہ انسان از روئے فطرت نیکی اور سچائی کو پسند کرتا ہے لیکن طمع اور خوف کے جذبات اس کو برائیوں کی طرف لے جاتے ہیں اگر اللہ کے مالک ہونے کا تصور رہا تو کوئی طمع اور خوف اس کو متاثر نہیں بنا سکتا۔

پھر یہ کہ انسان جب اپنے کو مستقل وجود سمجھتا ہے تب ہی خطروں کا خیال کرتا ہے مگر جب اپنے نفس کا مالک اللہ کو سمجھ لیا تو وہ خطروں سے بے نیاز ہوجائے گا۔ وہ مالک ہے لہٰذا اسے باقی رکھنا ہے تو باقی رکھے اور اُٹھالینا ہے تو اٹھالے۔ یہی تصور راہ حق میں بڑی سے بڑی قربانی کے لئے تیار کردینے کا ضامن ہے۔

حضرت امام حسینؑ کے سامنے یہ تصور بدرجہ اتم تھا پھر بھی احساس کہ ہمارا مالک اللہ ہے یزید کی بیعت سے انکار کا ذمہ دار تھا۔ جب اللہ کو اپنا مالک مان لیا تو اب کسی یزید کی بیعت کہاں ممکن ہے۔

انھیں اللہ کے مالک ہونے کا تصور کوئی حادث تصور نہ تھا وہ تو ان کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھا اس کے بعد یزید کی بیعت ان کے لئے ممکن ہی نہ تھی۔

اس تصور راسخ کے ناقابل تبدیل تقاضوں پر سختی کے ساتھ قائم و برقرار رہنا ہی وہ ''استقامت'' ہے جس کا قرآن نے تذکرہ کیا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا۔

اب اسی استقامت کو چاہے دنیا ضد سے تعبیر کرے جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ امام حسینؑ نے مشیروں کا کہنا نہیں مانا۔ ضد سے کام لیا وہ بڑے ضدی تھے میں کہتا ہوں کہ اگر اس کا نام ضد ہے تو کون نبی تھا جس نے ضد سے کام نہیں لیا، جناب ابراہیمؑ بتوں کی مخالفت سے باز آجاتے تو آگ میں کیوں پھینکے جاتے، جناب موسیٰؑ فرعون کی ہدایت ترک کردیتے تو مصر سے کیوں نکلنا پڑتا، یحییٰ نے بادشاہ وقت کو اس کی خواہش کے مطابق مسئلہ بتادیا ہوتا تو ان کا سر کیوں قلم کیا جاتا بلکہ ضد اگر اسی کا نام ہے تو سب سے پہلے اس فہرست میں خود حضرت

رب العزّت کا تذکرہ آنا چاہئے۔ اس لئے کہ جو نبی آتا اس کی تکذیب کی جاتی تھی، اسے ایذائیں پہنچائی جاتی تھیں یا اسے قتل کردیا جاتا تھا اور وہ تھا کہ نبی کے بعد نبی بھیجے ہی چلا جا تا رہا۔

مگر واقعہ یہ ہے کہ جو باطل پر قیام ہو وہ مذموم ہوتا ہے اور جو حق پر قیام ہو وہ ہوتا ہے صبر وثبات اور استقلال اور اسی کو قرآن مجید میں کہا گیا ہے ''استقامت''۔

حق پر استقامت کا نتیجہ کیا ہے؟ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان میں کوئی بچہ بھی خائف نہیں اور ان میں سے کسی کے قدم میں ذرّہ بھر تزلزل نہیں...... مگر وہ تیس ہزار کا لشکر...... انھوں نے روز عاشورا کتنی بار میدان چھوڑ دیا۔

اب لیجئے حزن کو...... حزن سے مراد کسی مصیبت سے متاثر ہونا یا تکلیف کا احساس کرنا نہیں ہے بلکہ یہ افسوس ہونا ہے کہ ہم نے کیوں ایسا کیا جس کا نتیجہ اس صورت میں رونما ہوا۔

واقعۂ کربلا کے بعد اُدھر شادیانے بج رہے ہیں۔ خوشی سے عیدیں ملی جارہی ہیں۔ مگر حقیقت میں افسوس ہے۔ افسوس احساس شکست سے۔ یزید کا یہ کہنا کہ خدا ابن مرجانہ پر لعنت کرے اس نے کیوں ایسا کیا۔ یہ اس افسوس کا مظاہرہ ہے۔ اسی افسوس کو آج تک یزید کی برأت ثابت کرنے کے لئے اس کے ہواخواہوں کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے مگر یہ برأت کا دعویٰ غلط ہے۔

بدیہی ثبوت اس کا کہ یزید ہی واقعات کربلا کا ذمہ دار تھا یہ ہے کہ اگر ابن زیاد نے اتنا بڑا اقدام بطور خود کیا تھا تو واقعہ کربلا کے بعد اسے حکومت سے معزول کیوں نہ کیا گیا۔ حالانکہ اہلبیتؑ کے ساتھ ذرا بھی مراعات کرنے والا ہر حاکم معزول کیا گیا مگر یہ شکست کے احساس کے بعد افسوس تھا جو ہر باطل پرست کو کبھی نہ کبھی ہونا لازمی ہے۔

مگر امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں میں سے کسی اور کا کیا ذکر، کسی بچہ تک کو یہ افسوس نہیں ہوا کہ امام حسینؑ نے بیعت کیوں نہ کی۔ حالانکہ کربلا کے مصائب تدریجی طور پر وقوع میں آئے۔ اگر کسی وقت افسوس ہوا ہوتا تو طرز عمل میں تبدیلی ہوجاتی اور مصائب سے بچنے کی تدبیر اختیار کی جاتی۔

کسے افسوس ہوا؟ اس کا ایک بدیہی ثبوت یہ ہوگا کہ یہ دیکھئے کہ یزید اور اس کے جانشینوں نے مطالبۂ بیعت سے دستبرداری کی یا حضرت امام حسینؑ کے جانشینوں نے انکار بیعت سے؟

یہ واقعہ ہے کہ حضرت امام حسینؑ کے بعد یزید نے آپ کے پس ماندگان میں سے کسی سے بھی بیعت طلب نہیں کی اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے مطالبہ سے ہٹ گیا اور ان حضرات میں سے کسی نے اپنے وقت کے حاکم کی بیعت نہیں کی۔

پھر آخر میں ایک اور ثبوت اس کا ملاحظہ ہو کہ جسے افسوس ہوتا ہے وہ واقعہ کو چھپانا چاہتا ہے اور جو خوش ہوتا ہے وہ اس کا اظہار کرتا ہے۔

اب آج تک دیکھ لیجئے کہ یزیدی جماعت کے افراد واقعۂ کربلا کے اظہار کو ناپسند کرتے بلکہ ہر طرح اس کے چھپانے کے درپے ہوتے ہیں اور حسینی جماعت کے افراد اس کی یادگاریں قائم کرتے اور اس کے ذکر کو بہرصورت زندہ رکھنے میں کوشاں رہتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ حسینی جماعت کو کارنامۂ حسینی پر بالیدگی اور فخر ہے اور وہ فخر اس کا ہے کہ حسینی قربانی نے حق وباطل کا امتیاز ہمیشہ کے لئے قائم کردیا جو آپ کا حقیقی نصب العین تھا۔

❁❁❁